# تدوین حدیث

## (۷)
## محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن حجاز سے نکل کر جب عرب کے دوسرے علاقے اور قبائل میں پہنچا تو تلفظ و لہجہ اور اسی قسم کے لسانی اختلافات جن کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا، نمودار ہوئے۔ اس قسم کے غیر اصولی اختلافات میں ہر ایک دوسرے کے اختلاف کو برداشت کرنے کی اپنے اندر صلاحیت اور گنجائش پیدا کرے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی عملی تربیت کا موقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی اختلافات کی بدولت مل گیا جو قرآنی الفاظ کے تلفظ وغیرہ میں پیدا ہو گئے تھے، ایسے عجیب و غریب اور دلچسپ واقعات اس سلسلے میں پیش آئے قدرتی ناگزیر اختلافات کو ارادی مخالفت و مخاصمت اور تفرق و جدائی کا ذریعہ بنا لیا اس دور جاہلیت کے جاہل عرب میں عموماً عادی تھے معمولی ناقابل لحاظ اسی قسم کے غیر اہم اختلافات کی بدولت خدا جانے کتنی خونریزیاں ان میں ہو چکی تھیں، کسی قسم کا اختلاف ہوان کے لئے ناقابل برداشت تھا، بلکہ ان میں جو زیادہ ذکی الحس صاحب عزم و ارادہ ہوتے تھے وہی ان اختلافات کے قصوں کو آگے بڑھانے اور ان کی آگ کو ہوا دینے میں سب سے آگے آگے نظر آتے تھے۔ آج کل بھی جیسے دیکھا جاتا ہے کہ اسی قسم کے قدرتی اختلافات مثلاً رنگ و نسل کے اختلافات یا دوسری مادری بنیادوں پر یہ اختلافات جن میں شکل و قطع اور زبان کے اختلافات ان میں سب سے زیادہ

ظاہر ہے کہ چہروں پر کسی کی کھال کا رنگین یا بے رنگ ہونا یا کسی شخص کا بجائے ... کے ... کے خاندان میں پیدا ہو جانا یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی، اسی طرح زمین کا کرہ جو واقع میں ایک ہے اس کی ملکوں اور اقلیموں میں تقسیم صرف ایک زمینی اور وہمی تقسیم ہے، کسی دریا پہاڑ یا اسی قسم کی چیز کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

حسب لینے والے اور فتنہ و فساد کی آگ کا ایندھن ان ہی معصوم اختلافات کی لکڑیوں کو بنانے والے زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے قومی احساسات زیادہ بیدار اور زندہ ہیں، وہی قوم کے لیڈر بن کر قوم کو جنگ و جدال قتل و قتال کی جہنم میں جھونکتے رہتے ہیں۔

خیر ہوا یہ کہ جب قرآن کے پڑھنے میں اس قسم کے اختلافات عہد نبوت میں رونما ہوئے تو شروع میں بڑی گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اسی سلسلہ میں خود حضرت عمرؓ بعد کو اپنا یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ

ہشام بن حکیم نماز میں سورۂ فرقان پڑھ رہے تھے میں نے جو کان لگایا تو دیکھا کہ بہت سے حروف کو وہ اس طریقہ سے ادا کر رہے ہیں جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھایا تھا، اس حال کو دیکھ کر میرا جی تو چاہا کہ نماز ہی میں اچھل کر اس شخص کو دبوچ لوںٹ، لیکن پھر ٹھہر گیا (یعنی نماز میں مشغولیت کی وجہ سے اتنی دیر کے لئے ٹھہر گیا) جب ہشام نے سلام پھیرا تو میں نے معاً اپنی چادر اس کے گلے میں ڈالی اور پوچھنے لگا کہ تجھے اس طریقہ سے قرآن کس نے پڑھایا ہے جو اس وقت تم کو میں نے پڑھتے سنا ہشام نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھایا ہے۔

میں نے ہشام سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے بھی یہی سورہ پڑھی ہے آپ نے قطعاً اس طریقہ سے مجھے نہیں پڑھایا جس طرح تم پڑھ رہے تھے۔ یہ گفتگو تو ان دونوں کے درمیان ہوئی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سرحد قرار دے کر فرض کر لیا جاتا ہے کہ زمین کا جو حصہ اس پہاڑ یا دریا کے اس پار ہے وہ اس حصہ سے جدا ہو گیا اور جو اس پار ہے پہاڑ یا دریا کا وجود تو واقعی ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اسی پر فلاں ملک ختم ہو جاتا ہے ایک فرضی بات کے سوا اور کیا ہے اسی طرح الفاظ اور معانی میں اصلی جوڑی بات ہے کہ کوئی واقعی تعلق نہیں ہوتا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پانی کو پانی کہا جائے گا فرض کیجئے کہ اسی پانی کا نام کوئی آگ رکھ دے تو واقعہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے بلکہ بہت سے لوگ ٹھنڈک پہنچانے والے پانی کو آگ ہی کہتے ہیں مگر لوگوں نے ان ہی مفروضہ اصطلاحات کو اس زمانہ میں شدید قومی کشمکشوں اور عداوتوں کی بنیاد بنا کر جو کچھ کیا وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہی ہوا

ٹ میں نے یہ ترجمہ حضرت عمرؓ کے الفاظ کدت اساورہ کا کیا ہے۔ دیکھو جمع الفوائد صفحہ ۱۹ ج ۲

میں نے اسی حال میں کھینچتے ہوئے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر کیا اور عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ میں نے سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے اس شخص کو پایا، ایسے حروف کے ساتھ یہ پڑھ رہا تھا جن کے ساتھ آپ نے یہی سورت مجھے نہیں پڑھائی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گفتگو سن کر پہلے تو مجھے حکم دیا کہ "ارسلہ" (تم اس کو یعنی ھشام کو چھوڑ دو) اس کے بعد ھشام کی طرف خطاب کرکے فرمانے لگے کہ

"ھشام تم سناؤ کیا پڑھ رہے تھے"

حضرت عمر کا بیان ہے کہ جس طریقہ سے نماز میں ہشام اس سورہ کو پڑھ رہے تھے، ان ہی حروف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانا شروع کیا جب ان کا پڑھنا ختم ہوگیا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہشام کی طرف اشارہ کرکے فرما رہے ہیں۔

هكذا انزلت — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

پھر میری طرف (یعنی حضرت عمرؓ کی طرف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہوکے اور فرمایا کہ

"عمر! اب تم پڑھو"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حسب ارشاد میں نے بھی ان ہی حروف کے ساتھ جن کے ساتھ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پڑھنا شروع کیا جب میرا پڑھنا ختم ہوگیا تو دیکھا کہ میری قرآۃ کی طرف بھی اشارہ کرکے فرما رہے ہیں۔

هكذا انزلت — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ

| | |
|---|---|
| ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف فاقرؤا ما تيسر منه | یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے تو جانتے کہ تمہارے لئے جو آسان ہو ان ہی حروف کے ساتھ اس کو پڑھو |

یہ روایت صحاح ستہ کی کل کتابوں میں پائی جاتی ہے، شارحین حدیث نے "سبعۃ احرف" کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے علاوہ اس کے میرے خیال میں بات وہی تھی کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے اس زبان کے الفاظ کو مختلف لہجوں میں ادا کرتے ہیں اور بھی اسی قسم کے اختلافات ہر زبان میں ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جس کی زبان جن تلفظ اور جس طریقہ کی عادی ہے اسی کے ساتھ قرآن کو پڑھے میرے نزدیک ان نبوی الفاظ کی ... اس باب میں بالکل صحیح ہے کہ "سبعۃ" (سات) کے عربی لفظ سے خاص سات کا عدد مقصود نہیں ہے بلکہ عربی محاورہ

میں حقیقت کے اظہار کا یہ عام طریقہ تھا، جیسے اردو میں "بیسیوں" وغیرہ کے الفاظ سے معین یا
خاص عدد بولنے والے کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ کثرت کا اظہار اس سے کیا جاتا ہے اور عربی
زبان کا یہ ایک عام محاورہ ہے۔ خیر اس وقت میرے سامنے اس حدیث کی شرح ہے بھی نہیں
بلکہ دکھانا یہ چاہتا تھا کہ عرب جو اس قسم کے اختلافات کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس برداشت کی صلاحیت پیدا کرنے کا موقعہ قرآن کے ان ہی
قرآنی اختلافات کی وجہ سے مل گیا۔ کبھی کبھی یہ دکھانے کے لئے کہ قریشی لہجہ کے سوا دوسرے لہجہ اور
الفاظ کے تلفظ کے دوسرے طریقے اسی طرح صحیح ہیں جیسے قریشی لہجہ و تلفظ صحیح ہے، باوجود قریشی
ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کو دوسرے قبائل کے لہجہ میں پڑھ دیا کرتے تھے مثلاً
روایتوں میں آیا ہے کہ سورہ رحمٰن کی آیت "علی رفرف خضر و عبقری حسان" کی جو آیت ہے
خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا گیا کہ اسی کو "علی رفارف خضر و عباقری حسان" کی شکل
میں ادا کر رہے ہیں، یہ وہی صورت ہے کہ "عمیا" کو کعب احبار "عموا" اور "عمیا" کو "صمیا"
"غلفا" کو "مغلوفا" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔

بہر حال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا کا قصہ اگرچہ ایک شخصی واقعہ ہے لیکن قدرتی
غیر ارادی اختلافات کو ارادی و اختیاری مخالفت و مخاصمت کے قالب میں ڈھال دینے کی عادت
عربوں میں کتنی راسخ تھی اسی عام عادت کی یہ کتنی اچھی مثال ہے خیال تو کیجئے کہ نماز ہی میں اچھل کر
دبوچ لینے کا ارادہ کرنا، نماز کے بعد گردن میں ہشام بیچارے کے چادر ڈال کر کھینچتے ہوئے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانا اور سب سے زیادہ اور بڑی بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے ایک صحابی کو محض اس اختلاف کی وجہ سے بے دھڑک کَذَبْتَ "تم جھوٹ بولتے ہو"
شاید ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہشام کے والد حکیم بن حزام کی حقیقی پھوپھی تھیں اس لئے بھی ان کا
صحابہ میں خاص مقام تھا سوا اس کے قریش مکہ بھی متاثر کرنے سے ان کا تعلق تھا لیکن حضرت عمرؓ میں اس
وقت تک اختلافات کے برداشت کرنے کی اتنی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اتنے بڑے معزز قریشی بزرگ کے
ساتھ کسی قسم کی رو رعایت روا رکھتے۔

کہہ دیا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان اختلافات کے باب میں عرب کے جذبات کس حد تک نازک تھے، مگر پیغمبر کی تربیت نے ان ہی عربوں میں کس رنگ کو پیدا کیا؟ یہی حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب کوئی ناگوار اور بری بات کی خبر آپ کو ملتی تو فرماتے کہ

ما بقیت انا و ھشام فلا یکون ذلک — جب تک میں اور ہشام دونوں آدمی باقی یعنی زندہ ہیں اس وقت تک، تو ایسا نہ ہوگا،

اسد الغابہ ج ۵ ص ۶۱

جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طریقہ کار کا اعلان ہوا کہ باوجود اختلاف رہنے کے آپس میں ایک کا دوسرے سے جدا ہو جانا یا مخالف ہو جانا غیر ضروری ہے بلکہ اختلاف کے ساتھ اتفاق کو بہرحال باقی رکھنا چاہیئے جب قرانی قرأت کے ذریعہ آپ نے صحابہ کی عملی تربیت اس سلسلہ میں شروع کی تو ابتداء میں بعض خطرناک واقعات بھی پیش آتے جن میں سب سے زیادہ اہم حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے صحابہ میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھی جاتی تھی کہ ان میں وہ اقرءھم تھے یعنی قران کے پڑھنے والوں میں یہ سب سے اچھے تھے اس اقرءٔ ہونے کی یعنی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے اس کی سند بارگاہ نبوت سے ان کو ملی تھی، قران کے ساتھ ان کی خصوصیت کا ذکر مختلف طریقوں سے کتابوں میں کیا گیا ہے، بہرحال ان کے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ مسجد نبوی میں دو صاحبوں کو نماز میں قران کو اس طریقے سے پڑھتے ہوئے انھوں نے سنا جو ان کی قرأت کے مطابق نہ تھا اور خود ان دونوں کی قرأتوں میں بھی اختلاف تھا حضرت اُبی ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے دربار رسالت پناہی میں حاضر ہوئے اور جو واقعہ تھا اس کا اظہار حضرت اُبی نے کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ جو کچھ تم نے پڑھا تھا مجھے سناؤ جب دونوں سنا چکے تو حضرت اُبی کہتے ہیں کہ فحسن شانھما دونوں ہی کی قراۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا اور کہا کہ خوب پڑھتے ہو، حضرت اُبی جن کا خیال تھا کہ قراۃ قران میں تمام صحابہ میں میں سند سمجھا جاتا ہوں، اپنے نزدیک خیال رکھتے تھے کہ جس قراۃ کو میں

سے ناپسند کیا ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کو ناپسند کریں گے، لیکن ناپسند تو کیا کرتے تعریف کی اور پھر ایسی دو قراتوں کو آپ نے سراہا جن میں خود بھی ہر ایک کی قرأت دوسرے کی قرأت سے مختلف تھی یہ حالات ایسے تھے کہ ابی جیسے راسخ الاعتقاد مومن کا بیان ہے کہ داخلیا فرقہ

فسقط فی نفسی من التکذیب ولا اذکنت فی الجاہلیت

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ حضرت ابی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قراۃ کے ان قدرتی اختلافات میں سے ہر ایک کے لئے گنجائش پیدا کرنا بلکہ دو مختلف باتوں کی تحسین و تعریف ان کی اس فطرت کے لئے جس میں سرے سے اختلافات ہی کی برداشت کی صلاحیت نہ تھی اسی فطرت کو قرآن کے متعلق تمام ممکن اختلافی شکلوں کے برداشت کر لینے پر آمادہ کرنا ایک ایسی بات تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ العیاذ باللہ پیغمبر کی نبوت اور رسالت ہی کے متعلق شک نہیں بلکہ جیسا کہ وہی کہتے ہیں تکذیب کا شعلہ بھڑک اٹھا، اور کیسا شعلہ، کہتے ہیں کہ ایام جاہلیت یعنی اسلام لانے سے پہلے تکذیب کی جو کیفیت قلب میں تھی اس کو اس تکذیب سے کیا نسبت؟ گویا ایمان و اسلام کا سارا سرمایہ اس حسی واردات پر قریب تھا کہ قربان ہو جائے جو موروثی طور پر ان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پہلے موجود تھا اور قریب تھا کیا معنی؟ وہ تو کہتے ہیں کہ سب کچھ کھو چکا تھا سارا سرمایہ ایمان کا اسی آگ کے شعلوں میں بھسم ہو چکا تھا، وہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ یہ فوری کیفیت ان میں اس وقت پیدا ہوئی حبیب العالمین کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ کھڑے ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابی کا قصہ گویا یوں سمجھئے کہ اسی وقت ختم ہو چکا تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس کیفیت کو تاڑ لیا یا کشفاً آپ پر ان کے قلب کی حالت کھل گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے کسی فہمائش کے جو آپ کا عام قاعدہ تھا محسوس فرمایا کہ اس وقت

---

لے مطلب حدیث کے معانی حدیث کے سب سے بڑے مستند شارح علامہ طیبی کے خیال کے مطابق بیان کیا ہے بعض لوگ جو عربی محاورات سے ناواقف ہیں زبردستی ان الفاظ کے معانی کو توڑنے مروڑنے کی کوشش انہوں نے اس غرض کی ہے تاکہ حضرت ابی کا دامن ایسے سخت الزام سے پاک رہے علاوہ عربی محاورے کی رو سے درست نہیں ہے نیز اس قصے سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کو بھی ان کا مطلب مہمل کر دیتا ہے حضرت ابی کا جب وہ حال باقی نہ رہا تو اب ان پر الزام ہی کیا رہ جاتا ہے کتنے صحابی ہیں جو کفر کی بدترین حالتوں سے نجات یاب ہوئے کیا اس لئے کہ وہ صحابی ہیں ان واقعات کا انکار کر دیا جائے۔

اس بیچارے کا کام فہمائش سے نہ چلے گا اور آخری اقتداری تدبیر جو پیغمبروں کو قدرت کی طرف سے مرحمت ہوتی ہے اسی اقتداری تدبیر سے آپ نے کام لینا ضروری خیال کیا، حضرت ابی کہتے ہیں کہ میرے اس حال کو محسوس کر کے

ضرب فی صدری — دو تین مرتبہ میرے سینہ پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا۔

یہ روحانی تربیت کے سلسلہ میں توجہ کی ایک شکل ہے[1] توجہ اور وہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کارگر نہ ہوتی تو اور ہوتا کیا۔ ابی کہتے ہیں

ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ تعالیٰ فرقا (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم وغیرہ) — میں اس توجہ کے بعد پسینے سے شرابور ہوگیا اور گویا ایسا معلوم ہوا کہ خوف سے میں خدا کو دیکھ رہا ہوں

ایک شر تھا جس سے حضرت ابی کے لئے ایک ایسا خیر پیدا ہوا کہ شاید اگر یہ حالت ان پر طاری نہ ہوتی تو اس کا موقع ان کو مشکل ہی سے میسر آسکتا تھا، پیغمبر کی توجہ نے خدا کو ان کے سامنے بے حجاب کر دیا، سارے مقامات طے ہوگئے۔

کچھ بھی ہو میں تو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف سے جو منع کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کہ جو اختلافات قدرتی واقعات کے لازمی نتائج ہیں ان اختلافات سے مسلمانوں کو روکا گیا تھا صحیح نہیں ہے بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ

---

[1] فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے "توجہ" کی مختلف قسموں کو بتلاتے ہوئے "توجہ بالید" یعنی ہاتھ سے توجہ کا اس کو بھی توجہ کی ایک قسم قرار دی ہے ابی بن کعب کی اس روایت کے سوا حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ کا جو حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا کہتے ہیں کہ اس وقت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوت بالید ہی سے کام لیا یعنی ان کی پیٹھ کو دونوں ہاتھوں سے آپ نے ٹھونک کر فرمایا کہ اب بیٹھ جاؤ بیان کیا گیا ہے کہ اس نبوی توجہ کے بعد گھوڑے پر سوار ہونے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ پر کوئی میخ ٹھونک دی گئی

ان اختلافات کا بنانا اس کا انسداد مقصود تھا اور اسی کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہی آدم کے اختیار میں ہے ورنہ غیر اختیاری امور کے مطالبہ کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں اور اگر یہ مطلب نہیں ہے تو قرآن کی ان آیتوں کے پڑھنے والے اس کا کیا جواب سوچا کرتے ہیں جب ان کے سامنے ابتدا سے آخر تک مسلمانوں کی ساری تاریخ جس میں عہد صحابہ بھی شریک ہے اور اختلافات سے معمور اور بھری نظر آتی ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اول سے آخر تک بہرے اور اندھے بن کر سارے مسلمان قرآن کے ایک ایسے قانون کو مسلسل انتہائی لاپرواہیوں کے ساتھ توڑتے رہے جس کا بار بار مختلف الفاظ میں اس کتاب میں اعادہ کیا گیا ہے۔ مالکم کیف تحکمون۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرانی قرأت کے اختلافات کی ایک ایسی قدرتی صورت پیدا ہو گئی کہ مسئلہ اختلاف میں جو مطلوب تھا اس کو غیر مطلوب سے الگ کر کے دکھانے کا موقعہ عملاً آپ کو مل گیا اور اس کا عملی درس مختلف شکلوں میں صحابہ کو دیتے رہے عبداللہ بن مسعودؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ وہ قرآن کو کچھ ایسے طریقہ سے پڑھ رہا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے پڑھتے ہوئے نہیں سنا تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو کچھ اس نے کیا تھا بیان کیا، ابن مسعود کہتے ہیں کہ جس وقت اس قصہ کو خدمت مبارک میں عرض کر رہا تھا، میں نے آں حضرت کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار محسوس کئے اسی مکدر چہرے کے ساتھ آپ نے ہم دونوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ

اقرءا فکلا کما محسن — دونوں جس طرح پڑھتے ہو پڑھتے رہو، تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو

ابن مسعود کی اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ

ولا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا فهلکوا (جمع الفوائد) — آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف مت کیا کرو تم سے پہلے بھی لوگوں نے اختلاف کیا تب تباہ ہوئے

آپ دیکھ رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دیکھ رہے ہیں، دونوں کی قراءتوں میں جو اختلافات تھے ان کو باقی رکھتے ہوئے، دونوں کو سراہتے ہوئے ہر ایک کی تحسین کرتے ہوتے یہ بھی فرماتے ہیں کہ "آپس میں اختلاف نہ کیا کرو" کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے اس حکم کی تعمیل کی یعنی "ولا تختلفوا" (آپس میں اختلاف نہ کیا کرو) کی تعمیل کی ممکنہ شکل کیا ہو سکتی ہے؟ ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے نہ لکھا ہو لیکن بحمد اللہ عملاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کو مسلمان ہمیشہ سمجھتے چلے آتے ہیں اور سمجھانے والے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں جو اصل واقعہ ہے اس کو سمجھاتے رہے ہیں۔

میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ ذکر کر رہا تھا کہ "تدوین حدیث" کی تاریخ میں ان کی تیسری اہم خدمت یہی تھی کہ اختصاصی راہوں سے حدیثوں کا جو ذخیرہ مختلف افراد میں پھیلا ہوا تھا، ان کی وجہ سے علم و عدم علم کے اختلاف کا جو ایک بڑا خطرناک پہلو پیدا ہو سکتا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآنی اختلافات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو عملی نمونے ان کے سامنے پیش ہوتے تھے ان ہی کو پیش نظر رکھ کر اختلاف کے اس خطرے کے انسداد کی پوری کوشش کی۔

ہوا یہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان دونوں راہوں سے یعنی خبر آحاد کے معلومات میں کمی و بیشی یا ان کے متعلق علم و عدم علم کی وجہ سے نیز رہتی دنیا تک تفقہ کی راہ دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جو کھولی گئی تھی اس راہ میں نتائج و نظریات کے اختلاف کی وجہ سے قدرتی اختلافات کی جن شکلوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، ان کی پیدائش کا سلسلہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا میں تو سمجھتا ہوں کہ ابن ابی ملیکہ کے حوالے سے الذہبی نے جو یہ روایت نقل کی ہے کہ

ان الصدیق جمع الناس بعد وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال

حضرت ابوبکر صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا

انکم تحدثون عن رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم احادیث تختلفون فیہا
والناس بعدکم اشد اختلافا فلا
تحدثوا عن رسول اللہ شیئا فمن
سألکم فقولوا بیننا وبینکم کتاب اللہ
فاستحلوا حلالہ وحرموا حرامہ
(تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱)

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں
روایت کیا کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو
اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت
ہو جائیں گے پس چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا
کرو، پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے
اور تمہارے درمیان اشتراک کا نقطہ اللہ کی کتاب
ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال
کہا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا
ان کو حرام ٹھہراؤ،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "تدوین حدیث" کی تاریخ میں عہد صدیقی کا یہ وثیقہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ حکم کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ روایت کے الفاظ سے جیسا کہ معلوم ہو رہا ہے صدیق اکبر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی باضابطہ ایک مجلس منعقد کی اور اس مجلس میں انھوں نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟

مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ تجویز کے واقعی اگر یہی الفاظ تھے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں تو ہر پڑھنے والا اس سے اسی نتیجہ تک پہنچے گا کہ حدیثوں کی روایت کے سلسلے کو حضرت ابوبکر چاہتے تھے کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے روک دیا جائے۔

فلا تحدثوا عن رسول اللہ شیئا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کسی
قسم کی کوئی بات نہ بیان کیا کرو

سے زیادہ واضح تعبیر اس مقصد کی اور کیا ہو سکتی ہے؟

مگر سوال یہ ہے کہ واقعی ان کا اگر یہی مطلب تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی اس تجویز کو مسلمانوں نے قطعی طور پر مسترد کر دیا نہ صرف پچھلے ہی زمانہ میں بلکہ صحابہ بھی ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہے اور دوسروں کو کیا کیا جائے اس تجویز کا علم تو ہم تک ایک ہی روایت اور سند کی راہ سے پہنچا ہے لیکن بیسیوں روایتیں دلالت کرتی ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ خود اپنی تجویز کی مخالفت کرتے رہے ازالۃ الخفا میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تخمینہ ہے کہ

| | |
|---|---|
| نزدیک[1] یکصد و پنجاہ حدیث از مرویات او درست محدثین باقی ماندہ است ص ۲۷ .. | تقریباً ایک سو پچاس حدیثیں حضرت ابوبکر کی روایت کی ہوئیں محدثین کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی ہے۔ |

ابن جوزی نے (۱۴۲) حدیثوں کا ذکر بقی بن مخلد کی مسند کے حوالہ سے کیا ہے (دیکھو تلقیح ص ۱۸۰) کچھ بھی ہو مذکورہ بالا تجویز والی ایک روایت کے مقابلہ میں سو ڈیڑھ سو روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ بلکہ متعدد روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں سے صدیق اکبر پوچھتے تھے کہ کوئی حدیث

---

[1] شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ نے یہ سوال اٹھا کر کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل صحبت پیغمبر کے ساتھ ان کے گوناگوں تعلقات وغیرہ امور کے لحاظ سے مذکورہ بالا تعداد حدیثوں کی بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ خود ہی جواب دیا ہے کہ حدیثوں کی روایت کا زیادہ تر موقعہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ملا۔ بے چارے حضرت ابوبکر کو چونکہ آں حضرت کے بعد دنیا میں رہنے ہی کا زیادہ موقعہ نہ ملا جو ملا بھی سو خلافت اور اس زمانہ کی سیاسی پیچیدگیوں کے نذر ہو گیا نیز ان کے زمانہ میں ایسے لوگ جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں حاضری کی سعادت میسر نہیں آئی تھی بہت کم مدینہ پہنچے تھے، صحابہ زیادہ تر ان ہی لوگوں سے حدیثوں کو بیان کرتے تھے، ورنہ جو خود شرف صحبت سے فیض یاب تھے محتاج نشدند ببیان احادیث توسط وے بلکہ اکثر آں حدیث از زبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بودند ص ۱۴۳ ج ۲۔ نیز ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ حدیثوں کے بیان کرنے کی ضرورت واقعات و حوادث کے پیش آنے کے وقت ہوتی تھی ابوبکر صدیق کو اتنی تھوڑی مدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی کہ واقعات ان کے سامنے کم پیش آئے۔

پیش آنے والے واقعہ کے متعلق ان کو معلوم ہو تو بیان کریں جو ہی سے کچھ دیر پہلے ہم سن چکے کہ میراث جدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے صحابیوں سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا علم کسی کے پاس ہو تو بیان کرے۔

سوال یہی ہے کہ پھر آخر ان کی اس تجویز کا واقعی مقصد کیا تھا قطع نظر ان باتوں کے کہ عام مسلمانوں نے ان کی تجویز سنی، اور نہ صحابیوں نے اور خود ان کا طرز عمل اس تجویز کے مخالف ہے اصولی سوال یہ ہوتا ہے کہ جس چیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع نہیں کیا تھا بلکہ گذر چکا کہ تکثیر سے روکتے ہوئے لوگوں کو اس پر آمادہ فرمایا تھا یعنی کثرت اشاعت سے روکتے ہوتے حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی ہمت افزائیاں کی گئی ہیں جن پر تفصیلی بحث گذر چکی

بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ کسی روایت کے چند الفاظ کو لے کر اس پر اس لئے اصرار کرنا کہ اپنی خواہش کی ان سے تائید ہوتی ہے، نہ یہ دین ہی کا اقتضا ہے، اور نہ علمی دیانت داری میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے حقیقت ہوتی یا واقعہ کی تحقیق کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اپنے خود تراشیدہ اوہام یا من مانے خیالات کو دوسروں پر خواہ مخواہ مسلط کرنے کی یہ ایک غلط اور مجرمانہ تدبیر ہے۔

آئیے اب اس روایت کے سارے الفاظ کا مطالعہ دوسرے واقعات کی روشنی میں کیجئے پہلے اس کو دیکھئے کہ مجلس میں اپنی تجویز کو رکھنے سے پہلے تمہیدی تقریر حضرت ابوبکرؓ نے جو فرمائی تھی اس کے الفاظ کیا تھے

| | |
|---|---|
| انکم تحدثون عن رسول اللہ | تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں |
| صلی اللہ علیہ وسلم احادیث | روایت کیا کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو |
| تختلفون فیھا والناس بعدکم | اور تمہارے بعد لوگ اختلاف میں زیادہ سخت |
| اشد اختلافا | ہوجائیں گے۔ |

(باقی آئندہ)

# دلائل القرآن

از

(جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی)

مستشرقینِ یورپ کی اندھی تقلید میں بعض دوسرے لوگوں نے قرآن مجید کے متعلق یہ خیال بڑی قطعیت سے ظاہر کیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ نبی کے الفاظ ہیں کیونکہ نبی اور خدا کے اسلوب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سطور ذیل میں اس مسئلہ پر ہم کسی قدر بحث کرنا چاہتے ہیں تاکہ غلط فہمی دور ہوجائے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے آجائے۔ اصل بحث سے پہلے چند باتیں پیش ہیں۔

(سہل و مشکل قرآن) قرآن حکیم خدا کا ایسا کلام ہے جس کو نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں اور نہایت چھپا اور مشکل بھی۔ اگر وہ ایک طرف معانی اور حکمتوں کا بے پایاں سمندر ہے تو دوسری طرف اس کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ عرب کے ان پڑھ بدو تک اس کو سن کر سیدھا سادا مطلب سمجھ جاتے تھے، خواص صحابہ جو اعلیٰ فہم و فراست اور گہرے علم کے مالک تھے اور جن کی زبان دانی مسلم اور مدبر مانا ہوا تھا اور جو اسلام کے زندہ نمونے کو دن رات دیکھتے رہتے تھے ان کو بھی ایک ایک سورہ کے مطالب پر برسوں غور کرنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ وہ اس بحر ناپیدا کنار کے احاطہ سے عاجز ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان حضرات نے وہ امور جو دائرۂ فہم انسانی سے بلند ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور صرف آیات محکمات جو روح قرآنی کہی جاسکتی ہیں ان کے علم و فہم تفقہ اور تدبر پر قناعت کی اور دریا سے بقدر ضرورت لے لیا سارے دریا کو ناپنے کی فکر چھوڑ دی۔ کیونکہ اگر قرآن عزیز کو سطح سے دیکھا جائے تو ایک نظر میں سب دیکھ سکتے ہیں اور اگر اس کی گہرائیوں کو تفصیل کے ساتھ ناپنا چاہیں تو جس قدر گہرائی میں جائیں گے اس سے آگے اور گہرائیاں ملتی جائیں گی "وہ دنیا ہے جہاں پانی"